

ہیں اور کبھی کوئی دار و اور بوفی لے کر بھی اترتے ہیں اور چاند جب پورا ہوت آتے ہیں اور پھر مست ہو گر لو ہر شور مچاتے ہیں... پھر ہمارے ہاں مہانوں کے ان داتا دزیرے بھی تشریف کرتے ہیں تو حکم فرماتے ہیں کہ اپنی عورت لاو.. تو ہم لا دیتے ہیں۔"

"زبردستی کرتے ہیں؟"

"ہاں سائیں زبردستی کس بات کی... یہ ہمارے بھائی کہ وہ حکم فرمائیں.. ہمارا کیا جاتا ہے سائیں.. عورت کا گیا جاتا ہے.. نہاد ہو کے پھر سے کھڑی ہے... چدمح ہمارے چھپر اور کشتبیاں ہیں یہ کنارِ امکیت میں ہے ان کی.. ہم سے کوئی لگان تو نہیں لیتے سائیں، مہربانی کرتے ہیں.. چلتے ہیں سائیں نہیں تو سورج تو جاتا کھڑا ہے..."

"چلو..."

اور وہ اندر کوئین کے وجود سے جڑے آہنی زینے کو تھامتے نیچے کھیت میں اتر آئے.. دھوپ کی تپش میں کی آچکی تھی..

"ویسے ایک بات ہے سائیں.. میرا باپ جب بوفی پی کر مست ہوتا تھا تو ہوتا تھا کہ یہ جو کشتبی بر باد کھڑی ہے.. بیشہ ادھر نہیں ہوتی.. بہت برس گزرتے ہیں ہاں تو ادھر سے خل کر سندھ سائیں میں اتر جاتی ہے.."

"کیا؟"

"ہاں سائیں.. میرا باپ بوفی پی کر جھوٹ نہیں بوتا تھا۔"

دوپاؤں جو مرغابی کے سیاہ بیجوں کی طرح چیڑتے کشٹی کے کنارے پر دوڑتے
ہوئے دکھائی دیتے تھے۔
بس دوپاؤں.. جیسے ان کے اوپر کوئی دھڑنہ ہو صرف دوپنگی چھمک ذہلی نالگیں
ہوں۔

صرف دوپاؤں جو کشٹی کے بالشت بھر چوڑے فٹ پا تھوڑے پر دوڑتے جا رہے تھے۔
یقیناً ان دوپنگی چھمک ذہلی نالگوں کے اوپر سرور کا سیاہ لشک مارتاد بن اس کی
پسلیاں روشن دیئے جلتی آنکھیں اور وہ مختصر لٹکی بھی تھی جو اس کے بینے شکو چھپاتی نہ تھی،
بیجوں ایسی چھوٹی پینچھے کی تھی کوچھپاتی نہ تھی کہ وہ ایک جنور کا بدن تھا جو چھپائے نہیں چھپتا۔
ان پاؤں کے پہلو میں ایک لمبا بانس تر چھا ہوتا تھا اور اس پر سرور کی انگلیاں سیاہ
کیکڑوں کی طرح پیوست تھیں جو بیجوں کی ماں نہ چھپتی ہوئی تھیں۔

بانس سندھ کے پانیوں کی تہہ میں ٹھوکر کھا کر مضبوط ہوتا تھا قائم ہو جاتا تھا تو
سرور کے بدن کے زور سے کشٹی آگے آگے ہوتی چلی جاتی تھی..

اس کے پاؤں کا جوڑا کشٹی کے چوبی کناروں پر جتنا لگلے ہے سے دوڑتا ہوا پہنچھے
ھے لشک پہنچتا تھا وہاں سرور بانس کو پانی سے نکالتا تھا اور پھر اطمینان اور دھیرج کے ساتھ
سانس درست کرتا وہاں ہو جاتا تھا۔

کشٹی کے تختہ فرش کو نہانوں کی پہنچی ہوئی دریاں اور غلیظ گذے ڈھکتے تھے اور
خادر ان پر لینا ہوا کہ بہر حال وہ اس کی سخت ہوتی کر کر کسی حد تک آرام میں رکھتے تھے اور
دیکھتا تھا تو اسے کشٹی کی چھت اور نچلے ہے کے درمیان میں بس بیکی دوپاؤں دوڑتے پھر

اطمینان سے لوٹتے نظر آتے تھے.. اور کبھی کشتی ذرا ذوق توان کے درمیان میں سندھ کے پانی بھک دکھا کر پھر بچے ہو جاتے تھے..

کشتی کی پشت پر جو چوبی ٹکون پانیوں سے بلند ہوتی تھی اس پر سرور کامال جعفر گوئھ مادر کر بیٹھا ایک چوڑے چوڑے کی مدد سے اس کے بھاؤ کی سست سیدھی رکھنے کی سعی کرتا تھا۔ اگلے حصے میں وہ دکھائی تو نہ دیتی تھی لیکن پہنچنی تھی جواب بھی اپنے سیاہ لوٹھرے بچے کے سنبھے سر کو اپنی چھاتیوں میں دیتے بیٹھی تھی اور کبھی کبھار ”ہوسرو را..“ کی بیٹھی ہوئی آواز سنائی دیتی اور پھر اپنی زبان میں اسے کبھی ڈاٹھتی اور کبھی زرمی سے پکارتی۔ کشتی کی چھت سرکندوں کی تھی ہے ایک تپال سے ڈھانپا گیا تھا تاکہ دھوپ اور بارش سے بچاؤ ہو.. اور وہ بُودیتی خستہ حال دریوں اور گدؤں پر دراز... سر تکے بازو درکھے دراز... سرور کے پنجہ نما پاؤں کو دوڑتے واپس آتے ایک تسلسل کے ساتھ دیکھتا جا رہا تھا اور کشتی کے پانی پر سرکنے کا احساس اس کے پورے بد ان میں آہستہ آہستہ سرکتا تھا۔

گھرے پانی میں داخل ہونے پر سرور بائنس انعاما دیتا اور کشتی بھاؤ کے زور میں بننے لگتی..

کشتی کے اندر وون میں وہند آتے تھے نہ ہی جھانکتے تھے..

یہ صاحب کا علاقہ تھا اس کا کرہ اس کی خلوت گاہ تھی..

کھلی فضا، دھوپ اور پانی کی قربت ان کی تھی..

نہ وہ صاحب کو جانتے تھے کہ وہ کون ہے، کہاں سے آیا ہے، کیا کرتا ہے.. اور نہ وہ ان سے واقف تھا.. وہ چند روز کے لیے اس کے کامے تھے، کتنے روز کے لیے.. یہ وہ نہیں ہانتے تھے.. کشتی سمیت وہ اس کی ملکیت میں تھے.. وہ صرف سائیں برمائی کو جانتے تھے جس لے انہیں مناسب پیگھی دی تھی اور حکم دیا تھا کہ صاحب کو سائیں سندھ کے اندر لے جاؤ.. سرتوں کے ذخیروں اور دریت کے ٹاپوؤں میں جہاں سائیں بولے تو خرات کردا اس کے روپی پانی کا دھیان رکھواد رخدادت کر دو..

کتنے روز کے لیے؟.. سرور نے پوچھا تھا۔

یہ مجھے بھی نہیں معلوم... سائیں برمائی نے کہا تھا.. جب تک صاحب نہ کہے تب

تک تم نے پانیوں میں ہی رہتا ہے، واپس نہیں آتا۔

صاحب شکار کا شوق رکھتا ہے اس لیے جاتا ہے تو ہم اسے خوش کر دیں
گے.. بندوق تو رکھی کھڑی ہے کشتی میں اور کار تو س بھی ہیں ..
ناا.. صاحب کو شکار کا شوق نہیں ...

پر ہم صاحب کو مرغابی، جل بگڑ اور سرخاب بخلا میں گے مار کر ...
ناا... سائیں برمانی نے سر بلایا تھا..

یہ عجیب ڈھنگ کا صاحب تھا.. اگر شکار میں شوق نہیں ہے تو اپنا گھر بار چھوڑ کر
ادھر کشتی میں فضول رہنے کو کیوں آگیا ہے... جب پالا پڑنے لگتا تھا تو سندھ کے بنیلے اور ہاپو
پرندوں سے بھر جاتے تھے.. اور پھر انکڑ کوئی دُریہ سائیں اور اس کے یار بیل رات درات
کے لیے اسے اور اس کی بیڑی کو دریا کے اندر لے جاتے تھے.. دن کے وقت پرندے مارتے
تھے اور رات کو دار دار بولی پی کر مست است ہوتے تھے... اور پھر وہ پکھنی پر نظر رکھتے تھے
اور دو انگیں رکھنے دیتا تھا..

غازی گھاٹ والی پر دوائے بھی کچھ انعام دے دیتے تھے اور بھی اس کے ہاتھ
خالی رہ جاتے تھے پر وہ انتہا لگانا کے سامنے اپنے پورے بدن کو کتے کی دم کی طرح بھاتا
ا نہیں رخصت کرتا تھا۔ شکایت نہیں کرتا تھا.. وہ دیرے سائیں جو تھے ان کی برکت اور
مہربانی سے ہی تو وہ ادھر چھپر بنائے کھڑے تھے.. کشتوں کے گھر پانیوں میں رکھتے تھے.. وہ
اسے اور اس کے قبیلے کو بے گھر بھی کر سکتے تھے.. پر وہ ذیمیر مہربان اور خدا تر اس لوگ تھے
ایسا نہ کرتے تھے۔

اگر وہ خالی ہاتھ رہتا تو پکھنی خالی نہ رہتی.. دوائے کچھ نہ کچھ دے کر جاتے... بھی
روپیہ پیسے اور بھی کوئی جھکا یا لگلی ...

یہ صاحب جو ہے تو شکار کا شوق نہیں رکھتا.. پر پکھنی کا شوق تو رکھے گا رب

چاہے ..

پکھنی نے بچ کے سر پر دباؤ زال کر اس کے منہ کو اپنے ٹھن کے قریب کیا..
سندھ سائیں پر سے آنے والی ہوا اس کے گریبان میں اڑ سے ہوئے جھلکے میں سے
گزرتی اس کی چھاتیوں کے ماں پر پکھنی تھی تو ان کے لوں کو نپلوں کی طرح پھونتے تھے اور

پورا بدن دودھ بھر اور پانیوں کی بانس سے ریچ جاتا تھا.. یہ پانی کی نبی میں گندھی ہوئی ہوا ایک
جاندار وجود کی مانند اس کی ڈھلی شلوار کے پانچھوں میں سرسر اتی جاتی تھی اور اس کی ہانگوں
پر اپنا لمس پھیلاتی اس کی کوکھ میں ہریاں بھرتی تھی ..

سندھ سائیں کی ہوا اس کے گھردالے کی طرح اس کے بدن پر نچاہوں ہوتی تھی
اور اسے مست کرتی تھی اور اسی سستی میں وہ اپنے بچے کے سر پر مزید ہاؤڈال کرائے اور
قریب کرتی تھی ...

سرور کے ہاتھوں میں تھاما ہوا بانس سندھ سائیں کے بینے میں اترتا جاتا تھا، تھہ کو
جالگتا تھا اور سرور اپنا پورا بوجہ ڈال کر اسے دھکیلنا کشتی کو کھینچتا جاتا تھا.. پھر اس بانس کو پانیوں
سے نکال کر کناروں پر آہستہ آہستہ چلتا اس کے پاس آ رکتا تھا ..
صاحب کشتی کے اندر لینا ہوا تھا ..

جانے آنکھیں نوٹ کر سوتا تھیا آنکھ میں لینا سرور کے دوڑتے پاؤں کو دیکھتا تھا ..
صاحب ذرا وڈیری عمر کا تھا.. اس کا جگہ شہریوں کی طرح بے ڈھنگ اور ایک بُلہنہن
کی طرح ذرا بے ڈول تھا.. سرور یا ماما جعفر جیسا پتلا چمک چھر روانہ تھا.. مہنگی مہنگی
خوراکوں سے پلا ہوا تھا.. صاحب ہر روز سراغی اور پلا دکھاتا ہو گاتا... ہماری طرح مر جیں
کوٹ کر سوکھی روٹی تو نہیں کھاتا ہو گا.. پتلے چمک جتنے والے مرد کا توپتی ہی نہیں چلا کہ وہ تم
پہ بے یا نہیں .. پر یہ شہری بہت بوجہہ ڈالتے ہیں ..

صاحب نے ابھی تک اس پر وہ نظر نہیں ڈالی تھی ..
اس لیے تو نہیں کہ وہ وڈیری عمر کا تھا.. عمر کے بڑھنے سے طبع حرص سے خالی تو
نہیں ہوتی بلکہ بڑھتی ہے ..

اسے یقین تھا کہ وہ اس پر وہ نظر ڈالے گا.. نہیں تو اس کے پھیبرے کافاً نہ ہے .. پر
آن تک اس کا کوئی پھیبر اخالی تو نہیں گیا تھا ..

گھرے پانیوں کے بعد یکدم کشتی کا وجود تھہ کو جالگا اور اس کی ریت پر گھسنے لگا اور
سرور نے پھر بانس اٹھایا ..

اس جھنکے کی وجہ سے خاور نے اپنا بازو سمیٹا اور انٹھ کر بیٹھ گیا ..
کشتی تھہ کی ریت میں انکھی اور گھنٹی ہولے ہولے آگے ہوتی تھی ...

سرور کے پاؤں اب بھی چوڑائی پر جتے رہتے تھے لیکن ان کی رفتار گہرے پانیوں کی نسبت اب بہت کم ہو چکی تھی بلکہ وہ دوڑنے کی بجائے چلا تھا۔ انھوں کریمہ جانے کی وجہ سے اب وہ سندھ کے رستے کناروں کو دیکھ سکتا تھا جن پر آگے سر دست اور جنگلی جھازیاں کشتوں کے بہاؤ کی مانند انک ایک کر پیچھے رہتے جاتے تھے۔

اس سفر کا جواز کیا ہے؟

کشتوں کی ہر انک ہر جھنکے کے ساتھ یہ سوال دو ہر یا چار بات تھا۔ کیا ہے... کیا ہے... کیا ہے... کیا ہے... غازی گھاث کے کناروں سے جدا ہوتے ہی اس سوال نے ہزاروں بار اپنے آپ کو دو ہر یا تھا۔ گھڑی کی انک کی مانند مسلسل دسک دسک دیتا تھا اور دروازہ گھٹانا تھا کہ اس کے پیچے جھانک کر پتا چلے کہ جواب کیا ہے۔ شاید زندگی کا جو جواز ہے۔۔۔ اگر ہے۔۔۔ تو وہی اس آپی سفر کا جواز ہے۔۔۔ اگر ہے۔۔۔

آج دوپہر وہ ایک کھڑکھڑاتی نو یونا میں چوٹی زیریں کے گاؤں سے۔۔۔ کوہ سلمان کے دامن سے۔۔۔ غازی گھاث تک آئے تھے۔۔۔

چوٹی زیریں میں جہاں برمانی کا ڈیرا تھا جسے وہ شیخ کہتا تھا۔ ایک جو ہر نما تالاب کے کناروں پر سفیدے اور سمجھور کے درخت اونچے ہوتے چلے جاتے تھے اور ان کے سامنے میں اگرچہ ان کا سایہ بے برکت ہوتا ہے اناروں اور مالنوں کے نجھنے پڑتے جن کے پھواؤں کی کھٹی مہک شام کو تیز اور تند ہو کر اس تالاب کے ایک کونے میں۔۔۔ انگور اور بکن ولیاں بیلوں سے ڈھکے اس ایک کمرے کے اندر تک آتی تھی جس میں کتابوں کے ذمیر تھے، قدمیم کھنڈروں میں سے جمع کردہ میکے، چوڑیوں کے ٹکڑے، سکے اور صحتی ماتا کے منی کے شکنے جیسے تھے، جس میں برمانی اپنے آبائی گھر سے اپنے خاندان سے الگ۔۔۔ رہتا تھا۔ اور وہ تھا نہیں رہتا تھا۔ ایک چھوٹی سی چوہیا جب وہ نیند میں ہوتا تو اس کی انگلیوں کی پوروں اور ناک پر اپنا بے دانت رکھ کر انہیں چلانے کی کوشش کرتی اور وہ بے دھیانی میں اور نیند میں کروٹ بدلتا تو چوہیا بکشکل اپنے آپ کو بچا کر ذرا الگ ہو کر دبک جاتی اور ایک اور موقع کا انتظار کرنے لگتی۔۔۔ اور چھت کے کڑیوں میں ایک بے ضرر سانپ کا بسرا تھا جو زیادہ تر اپنے آپ کو پوشیدہ ہی رکھتا۔ صرف سال میں ایک بار اس کی کینچلی یہ ظاہر کرتی کہ وہ ابھی تک وہاں ہے۔۔۔ اور برمانی ایک چوہیا اور ایک سانپ کے ہمراہ اپنے بیوی بچوں کی نسبت زیادہ

ہم آہنگ سے رہتا تھا اور اس نے کبھی بھی انہیں کوئی گز نہ پہنچانے کا سوچا، بھی نہ تھا۔
برمانی دراصل اس کے آوارہ گرد باب کا ایک تسلی تھا۔

وہ عمر میں اس سے کہیں... بلکہ بہت چیختے تھا... لیکن وہ ایک بزرگ کی طرح اس کی
تعقیم کرتا تھا۔ اس میں وہ اپنے آوارہ خصلت باب کی پر چھایاں دیکھتا تھا۔ یہ پر چھایاں اس
کے بدن پر پڑتیں تو وہ پھر سے پچھنے کی جانب لوٹ جاتا۔ شاید یہی ان کی دوستی کی بنیاد تھی۔
برمانی بھی اپنی روزمرہ کی آسودگی اور تہذیب یا فتنہ زندگی سے یکدم خارج ہو کر
نامب ہو جاتا۔ اس کے بال بچوں اور ماں باپ کے ماتھوں پر صرف ایک سلوٹ ابھرتی اور وہ
اس کی گشیدگی سے سمجھوڑ کر کے پھر سے اپنے روزمرہ کے کاموں میں الجھ جاتے۔ اس کے
دوست اسے ملنے کے لیے کنج تک آتے اور کمرے کا دروازہ مغلل پا کر جان جاتے کہ دیواں گی
اس کی اور صحرائیں لے گئی ہے۔

اس کی گشیدگی کا سب سے زیادہ تلقی اس چوبیا اور سانپ کو ہوتا۔ وہ اس کی
پیر موجودگی سے بہت دلکھی اور بے حد تہبا ہو جاتے۔ ان انہوں کی نسبت جو اس کے رشتے
میں تھے وہ اس کی غیر حاضری کو زیادہ محسوس کرتے۔

چوبیا اس کے خالی بستر کے قریب اپنابے دانت منہ چلاتی رہتی اور شبہتیر دل میں
اپنے اکنہ اسانپ کچھ روز کے لیے اپنی کینگل اتارنے کا ارادہ ترک کر دیتا۔
پھر کسی شامِ ذھول میں انہا ہوا بڑھی ہوئی داڑھی اور سرخ آنکھوں میں دیواں گی۔ فر
کے آنار لیے برمانی واپس آ جاتا مگر گھر کی بجائے اپنے کنج میں آ کر سوچاتا۔ اور کبھی روز بعد گھر
والوں کو خبر ہوتی کہ وہ وابس آچکا ہے۔

برمانی نے ہی اس کی اس آب نور دی کا بند و بست کی تھا۔
دونوں میں تہائی قدر مشترک تھی۔

وہ بال بچوں کے باوجود الگ تھا۔ اور اسے زندگی کے نشیب و فراز اور عمر کے بہاؤ
لے تھائی کے جزیرے پر لا پہنچنا تھا۔ نہ برمانی اپنے اکلا پے کے ذیرے سے باہر تدم رکھنا
ہاتھا تھا اور نہ ہی وہ اس جزیرے کی قید سے رہا ہونے کے لیے کسی کشتوں کی خواہش کرتا تھا۔ یہ
الہائی عذاب نہ تھی ان کی خصلت تھی جو رخصت نہ ہو سکتی تھی۔

”بکری سائیں...“

یکدم مرغابی کے پتوں ایسے پاؤں رکے ان کے اوپر کا دھڑ جھکا اور سرور کا سیاہ
مہاندرہ اس کے عین سامنے نمودار ہو گیا۔

”بکری؟“

”مرغابی سائیں...“ اور یہ لفظ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں جل انجیں روشن
ہو گئیں۔ اس کے باقیہ وجود سے الگ ہو کر دکھنے لگیں۔
”آؤ سائیں.. باہر آؤ“ سرور نے ہاتھ آگے کر دیا۔

اس کا ہاتھ تھام اس نے کشتی کے ڈولتے ہوئے کارے پر قدم رکھا اور
قدرے مشقت سے کہ لیئے رہنے سے اس کے بدن میں جو تھوڑی بہت لچک باقی تھی وہ
بھی جامد ہو چکی تھی وہ باہر آگیا۔ سرور نے اس کا ہاتھ تب تک نہ چھوڑا جب تک وہ کشتی
کے اگلے حصے کے تختوں پر نہ آگیا۔ دھوپ میں جو تیزی تھی وہ رخصت تو ہو چکی تھی
لیکن کشتی کے اندر دن کی عافیت بھری چھاؤں کے بعد اب اسے پوری آنکھیں کھوں کر
دیکھنا و شوار لگ رہا تھا۔

پکھنی نے سراخا کر اسے نظر بھر کر دیکھا۔ اس کا بچہ دودھ سے سیراب ہو کر کشتی
کے خالی تختوں پر اونڈھا پڑا اور ہاتھا پر اس نے اپنا جھگکا نیچے نہیں کیا تھا۔ صاحب کو فریب
دینے کے لیے نہیں.. بلکہ سندھ سائیں کی یہ نہ ہوا کی خندک کو اپنے تن پر ہولے سے چلتے
جانے کے لیے.. لیکن صاحب اس کی موجودگی سے غافل رہا۔

پکھنی نے دل ہی دل میں اسے ”ماں چو..“ کی گاہی دی اور جھگکا نیچے کر لیا۔

کشتی رکی ہوئی تھی ..

اگر وہ پکھنی کے وجود سے غافل تھا تو سرور ان سب کے.. صاحب کے.. پکھنی اور
ماں جعفر کے اور اپنے وجود سے بھی غافل تھا۔ اس کی آنکھوں میں بکری کے الاڈ جلنے
تھے..

اس نے تربال کے نیچے سے لکڑی کی ایک ٹکنگی سی نکالی ایک صلیب نمائشے...
اس میں ایک کار تو سپھسایا، پھر اس کے اوپر اپنی پرانی بندوق رکھی ایک چاقو کھوں کر اس کے
بلیڈ کو زبان پر پھیر کر اس کی تیزی کی تسلی کرنے کے بعد اسے منہ میں دانتوں تلمے دا با۔ اور

ہر اس تکلی کو پانی میں ڈال کر بہت آنکھی سے خود بھی اڑ گیا۔ اسے اپنے آگے آگے
وہ حکیما تیرتا اپنے وحہ کو پانی میں ڈبو کر صرف اپنا سر سطح کے اوپر رکھتا ہیرے دھیرے اور
درکت کرنے لگا جدھر تکڑی تھی۔

ماما جعفر بھی اپنے بھائیج کے ہمراہ برادر تیرتا تھا۔

وہ اگرچہ خاور کے برابر میں کھڑا سر در کو پانیوں میں نظر بارا دپوش۔ تکلی کو ایک
اصال کی طرح ایک فاب کی مانند حکیما رکھتا تھا لیکن اس کی آنکھیں بھی بجزک رہی تھیں
اور وہ بھی جیسے سرور کے ساتھ تیرتا جاتا تھا۔

”یہ ایسا کیوں کرتا ہے جعفر؟“

ماما جعفر نے اپنی توجہ کو ایک لمحے کے لیے نوٹنے لے دیا۔ سرور پر نظر رکھے اس
کے وجود سے غافل ڈہ بولا ”یہ لکڑی کا تو لا بے سائیں۔ جس کے پیچھے پیچھے سرور تیرتا
ہے۔ مرغابی کے قریب جاتا ہے۔“

”مرغابی کدھر ہے؟“ اسے تو سرور دور تک جہاں تک نظر جاتی تھی سوائے پانیوں
کے اور کناروں کے اور سر کنڈوں اور سرونوں کے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

”تم تو دیکھتے ہی نہیں سائیں۔“ پہنچی بولی ”تمہیں کیا نظر آئے گا۔ مرغابی اور
ہے جدھر کو سرور تیرتا کھڑا ہے۔ پر تمہیں نہیں دکھے گی۔ پر پانی کے پونگ اسے دیکھے لیتے
ہیں۔“

”اوھر ہے سائیں۔“ ماما جعفر نے کچھی کے لبھ کی تکنی کو محسوس کیا اور اس کی
ہداؤ آیا ”جدھر ناپو ہے پانیوں میں ابھرا ہوا۔۔۔ اس پر ہے۔۔۔ دو ہیں۔۔۔ ایک لکڑی ہے اور
وہ سری بوہلے ہے جو پوٹھی ہلاتی رہتی ہے۔۔۔ دیکھتے ہو؟“
”نہیں۔۔۔“

اس کی اور ان کی نظر میں فرق تھا۔

اسے وہ پانیوں میں ابھرا ہوا رہتا تاپ جس پر چند جہازیاں اور کہیں کہیں گھاس
کے ننگے تھے مشکل سے دکھائی دیتا تھا اور اس پر کوئی اور شے نہ تھی۔ اور اس کی جانب سرور
اپنے تو لے کو دھکیما اتنی دور ہو چکا تھا کہ وہ یہاں سے دکھائی یوں دیکھا جیسے سندھ کے
پانیوں میں ایک بے جان بے ضرر جہازی ہے جو بکتی ہوئی جا رہی ہے۔۔۔

بہاؤ کے زور میں.. اس کے ساتھ.. آہنگی سے ایک اور جہاڑی جو بھی کناروں پر
اپنی جزیں گھبری کیے سندھ سائیں کو علیق تھی اور پھر اس کے پانیوں نے اس کی بنیاد کو ہلا کر
اسے اپنے آپ میں بے بس اور بے اختیار کر کے شامل کر لیا.. ایک اور جہاڑی بے جان اور
بے ضرر بھتی ہوئی جا رہی تھی... اور یہی فریب تھا، کسی بھی پکھروں کے لیے.. کہ یہ تو ایک اور
جہاڑی ہے جو بھتی ہوئی میری جانب چلی آتی ہے... نہ اس پر کوئی شستگاہے پر انہی بندوق
ہے جس کی نالی کارخانہ اس کی جانب ہے.. نہ کوئی کارتوس اس میں پوشیدہ ہے اور نہ ہی اس کے
عقب میں کوئی ایسی سیاہی چھپی ہے جس کی آنکھیں بھر کتی ہیں اور اس کے دانتوں میں اس کی
گردان پر پھیرا جانے والا ایک چانو بھنپنا ہوا ہے.. اور یہی وہ فریب کا جاں تھا جو بے جان اور
بے ضرر دکھائی دیتا اس کی جانب بڑھتا آتا تھا.. ایک اور جہاڑی تھی..

اے.. خادر کو چلی بار احساس ہوا کہ دراصل کیا صورت حال ہے.. تو لے کو
ذھال بنا کر اپنے آپ کو پوشیدہ رکھتے ہوئے سرور کے دل میں ایک قتل کا منصوبہ تیرتا
ہے.. یہ... مرغاییوں کو مارنے گیا ہے جعفر؟“

لاماں جعفر اس سوال سے اپنے سحر انگیز گلزاری کے جادو میں جتنا سکوت میں سے
یکدم باہر آیا اور سر بنا کر کہنے لگا ”مرغابی ہوتی کس لیے ہے سائیں.. ہم مہانے جو ہوتے ہیں تو
ہم سندھ کا پونگ ہیں سائیں.. چھلی کے پچھے سمجھتے ہو ہاں صاحب.. تو سندھ سائیں ہمارا ان
داتا ہے.. رزق دیتا ہے سائیں.. ہمارے ان پانی کا بند دست کرتا ہے.. تو یہی ہمارا ان پانی ہے
سائیں.. مرغاییاں؛ جل گلزاری سر غابِ منگھ اور چھلی.. یہی رزق ہے ہمارا... سرور جاتا ہے تو
مرغابی کی چونچ دیکھنے کو تو نہیں جاتا ان دو لگنے اور خندے سیت پانیوں میں.. اُس کے ماں کی
گرمی کو اپنے لیے گھیرنے کو جاتا ہے..“

سندھ کی آبی چادر کے تنازع میں... احلى دھوپ میں پچھی ہوئی چادر میں صرف
ایک جہاڑی بھتی ہوئی اُس ٹاپو کے قریب ہوئی جو اسے مشکل سے دکھائی دیتا تھا.. پھر ایک
ہلکی سی گونج سنائی دی.. ایک مدھم سے فائزگی آواز بہت دبی دبی پانیوں پر تیرتی اس کے کانوں
تک آئی اور اسی لمحے اس نے دیکھا کہ ٹاپو کی ریت سے.. چند جہاڑیوں اور گھاس کے ٹکنوں
کے درمیان میں سے دو سیاہ دھبے سے اٹھتے ہیں اور پھر پھر اتے ہوئے سندھ کی آبی چادر پر
بلند ہوتے ہیں..

”مال چو...“ پکھی زیر لب بڑا۔

مال جعفر نے غصے میں آگر اپنی مخفی ران پر ہاتھ مارا لیکن پکھنے کہا۔
وہ جھاڑی پکھ دیر ناپ کے قریب رکی رہی سکتے میں آئی رہی اور پھر رخ بدلتے
کشی کی جانب لوٹنے لگی۔ لیکن اب وہ بہت تیزی اور شتابی سے واپس آرہی تھی۔ ان کے
قرب ہوتی گئی۔

سرور اپنے تو لے کو دھکیتا کہیتا ہوا کشی سے آگا۔

”نکل گئی بہن چو...“ سرور پانی سے باہر آیا تو وہ بری طرح کانپ رہا تھا۔ اس کی
اتسی اس کے بس میں نہ تھی اور کٹ کٹ بے اختیار بھتی جاتی تھی۔ جیسے اسے نموبیے کی
لکھی چڑھ گئی ہو۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے تو لے کوپانی سے نکلا۔ چاقو جو اس کے دانتوں کا
ایک حصہ بن چکا تھا سے کھینچ کر مند سے نکال کر کشی کے عرش پر پہنچنے کا۔ فالتو کار تو س اور
ہدوں کو تو لے سے جدا کر کے اسے پھر سے تپال کے نیچے کھسپڑ دیا اور پھر ہائپنے لگا۔ ”صاحب
بڑے وزن والا اور چربی دار گوشت تھا تکڑی کا۔ اذی ہے تو مشکل سے اپنا بوجھ سہارتی
تھی۔“ نکل گئی بہن چو....“

”سرور...“

”جی سائیں..“

”پر نہہ نہیں مارنا۔ آئندہ!“

”ہیں؟“

”مرغابی پر فائز نہیں کرنا۔ آئندہ!“

”پر کیوں سائیں؟“

”اس لیے کہ کسی ایک مرغابی کا خوشی سے کوئی تعلق نہیں۔“

وہ جھکا اور پھر کشی کے اندر چلا گیا۔

”کیا مال چو۔ صاحب ہے۔ پر نہہ نہیں مارنا کہتا ہے۔“ مرغابی پر فائز نہیں کھولنا کہتا
ہے۔ سرور بڑا تاگیا اور خندک کامرا ہوا تھخترتا گیا۔ وہ اب اس لائق نہ رہا تھا کہ کشی کو کچے
سلتا۔ چنانچہ مال جعفر نے بالنس تھاما اور تہہ کی کھوچ میں اسے پانیوں میں ڈبوتا گیا۔
تحوزی دیر بعد وہ مال جعفر کے دوپاؤں کشی کے چوبی کناروں پر دوڑتے ہوئے

دیکھ رہا تھا اور کشتی ہو لے ہوئے آگے ہوتی جاتی تھی۔
 دُڑیرے سائیں تو اس کی چھاتیوں کو دیکھ کر ہونت گیلے کرتے تھے اور یہ اس کی
 جانب دیکھنا نہیں تھا... پکھی نے مایوسی میں سر ہلایا۔
 پچھلی شب بے خوابی میں گزری تھی..
 برمانی کے سُخ میں پچھلی شب بے خوابی میں گزری تھی..

اس لیے کہ وہاں وہ چوہ بیجا تھی.. وہ ایک چوہ بیمار اس بھر پر بیشان رہی تھی کہ یہ ناک
 جسے میں کترنے کی کوشش کرتی ہوں وہ ناک نہیں ہے جسے میں ہر رات کترنے کی کوشش
 کرتی ہوں اور یہ پاؤں بھی نہیں جن کی انگلیوں پر میں اپنا منہ چلاتی ہوں.. تو یہ ناک اور یہ
 پاؤں کی انگلیاں کس کی ہیں اور یہ کون ہے.. وہ جاگتا رہا تھا.. اس چوہ بیما کو بھگانے کی کوشش کرتا
 رہا تھا.. پر وہ کہاں جاتی.. وہ اپنے گھر میں تھی اور وہ نہ تھا..

کشتی کے بھجو لے ایک ہمود تسلیل کے ساتھ اس کے پہنے بھاری کرنے
 لگے.. اور وہ او ٹکھنے لگا.. گدؤں کی بدبو اور پانی کی نمی کی عادت اس کی ہاک کو ہوتی جاتی
 تھی.. وہ او ٹکھنے لگا.. بدن کیوں ساتھ نہیں دینا زوال آتا ہے تو اسے قبول کرنے کا شعور
 اس کے ساتھ کیوں نہیں آتا... اعضاء کیوں بیگانے سے ہو جاتے ہیں.. ان کا توازن کہاں گم
 ہو جاتا ہے.. سانحہ بر س کی عمر تو کوئی عمر نہیں ہوتی... یا ہوتی ہے... اگر ہوتی ہے تو پھر ایک
 فل سنپ آنا چاہئے کہ بس یہاں تمہارا لکٹ ختم ہوتا ہے، یہی تمہاری حد ہے.. اُتر جاؤ.. تم
 آگے نہیں جاسکتے.. پر کوئی نہیں روکتا.. آگے جاتے ہیں تو چلانا پھرنا دو بھر ہونے لگتا
 ہے.. اپنے ہاتھ پاؤں پرائے ہونے لگتے ہیں کہا نہیں مانتے.. سیر ہیوں کی بجائے قدم لکٹ
 کی جانب جاتے ہیں.. دوسرا دل کے بدن کی پھرتی اور بے پروائی زہر لگتی ہے.. ڈاکٹر طاہر نے
 کیا کہا تھا.. یو ہیونو ہو دو اٹ... توازن بھیش کے لیے برقرار نہیں رہتا.. یہ ذول گیا ہے تو اب
 کبھی درست نہیں ہو گا.. جو دردیں بے وجہ تمہارے بدن میں اٹھتی ہیں ان کے بھراہ رہنا یکجہ
 لو.. یہ اب کہیں نہیں جائیں گی.. تم چلے جاؤ گے.. یا پاہمکوے نے درست کہا تھا کہ جب
 ایک مرد کے رس کی روائی حکم جائے تو اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہوتا.. اگرچہ وہ مکمل
 طور پر تھے تو نہیں تھے لیکن ان کی روائی میں خل پیدا ہو گیا تھا..

جعفر کے دنوں پاؤں کشتی کے فٹ پاٹھ پر دوزتے جاتے تھے اور باش تباہ کی

خلاش میں ڈوبتا جاتا تھا..
اور کشتی پانیوں کی وسیع گود میں ہمکتی ہوئی ملاپ کی سرخوشی میں مست ہوتی..
بہتی جلی جاتی تھی۔

کچھ اپنے بھاری کو لہوں پر بر اجہان ڈھلتے سورج میں تھی اور بچہ گھبری نیند میں
تھا..

مد تمیں گزر گئیں اور پھر ایک شدید دھمکے نے اسے بیدار کر دیا.. سکوت تھا.. ہر
شے نخبر اؤ میں تھی.. مدھم دھوپ اندر آتی تھی اور کشتی کے کنارے جعفر کے پاؤں سے خالی
تھے.. اس کی آنکھوں میں نیند سرخ ہوتی تھی..

اس نے ٹکدیاں کشتی کے فرش پر بنا کر اپنے آپ کو اوچا کیا اور باہر نظر
کی.. سندھ کے پانی نہایت مدھم اور کوئی سروں میں بہہ رہے تھے.. کشتی ایک بلند ریتنگی
وہلوان سے اپنی چھاتی لگائے آہستہ آہستہ ڈول رہی تھی..
وہ اپنے یہم خوابیدہ وجود کی مستی میں ڈولتا باہر آگیا..

کوئی ناپو تھا.. پانیوں کے درمیان میں..

کشتی سے ذرا فاصلے پر سرور پانیوں پر شست لگائے بت بنا بیٹھا تھا..
دریا کے کنارے ایک ٹکونے جال کو دنوں ہاتھوں سے اٹھائے وہ پانی پر نظریں
جھائے ایک سحر زدہ سانپ کی طرح دمروں کے بیٹھا تھا..

جال کے سوراخوں میں سے مدھم دھوپ کسماں ہوئی نکلتی تھی..

”اوھ رات کریں گے صاحب...“ ماں جعفر جو کشتی کھینے کی مشقت سے ذرا
برے حالوں میں تھا سانس اندر کھینچ کر بولا اور اس کے مان جانے کے انتظار میں رہا پھر
قریب آگیا۔ ابھی روشنائی ہے.. کشتی سے سامان اتارنے تباہ کرنے اور روٹی پانی بنانے میں
صیبیت نہیں ہوگی.. ابھی اور آگے گئے تواریت ہو جائے گی..“

اس نے سرہادیا اور کشتی سے اتر کر... نیچے ریت کناروں پر گیلی تھی جس میں اس
کے جو گرخنوں تک دھنس گئے.. کشتی سے اتر کر ڈوبتے سورج کی جانب چلنے لگا جہاں سرور
وہ عنی رمائے اپنے گیان و حیان میں گم بیٹھا تھا..
وہ دم روکے بیٹھا تھا.. پانی سے نظر نہ ہناتا تھا.. وہ اس کے قریب ہوا تو بھی اس

نے آنکھ اٹھا کر اس کی جانب نہ دیکھا.. وہ پانیوں کا ڈول اپنے آپ میں گمراہا.. خاور نے بھی کچھ
نہ کہا اور اسے دیکھا رہا.. اور پھر بہت دیر بعد وہ بولا تو انہیں اس کی جانب نگاہ نہ کی۔
”مل گیا تو شکار نہیں تو بیکار...“

اس نے اپنے جو گراہارے اور سرور کے برادر میں بینچھا گیا.. نگے تکوں تکے دریت
کے ذریعے مخندگ میں تھے اور پاؤں کو ایک بیب بیب سکھ سے آشنا کرتے بھرتے جاتے
تھے ”کچھ ہاتھ آیا؟“

”صاحب آپ نے پرندوں کی مناہی کر دی ہے.. پھلی کی تو نہیں..“
”نہیں..“

”ا بھی تو دیدار نہیں ہوا“

”دم رو کے ہوئے بینچھے ہو..“

”ہاں سائیں.. کسی کا دم رو کرنے کے لیے اپا دم بھی روکنا پڑتا ہے.. پھلی کو تو
آنکھیں جھکنے سے خبر ہو جاتی ہے کہ سر پر فکاری ہے جو سانس لیتا ہے.. وہ سرگوشی میں پالی
پر سے نظریں ہٹائے بغیر بولتا رہا..

”تمہیں دکھائی دے جائے گا جب پانی میں پھلی تحریتی ہوئی آئے گی؟“

”نہ سائیں.. سندھ سائیں کے پالی گدے ہیں ان میں کچھ بھی دکھائی نہیں
ویتا..“

”تو پھر کیسے جان جاؤ گے؟“

”پالی پر آنکھیں رکھتے ہیں ہاں سائیں.. وہاں پر بلبلے اٹختے ہیں جدھر سے وہ دیدار
کر دانے والی معموق آتی ہے.. پانی میں بلبلے تو نئے رہنے ہیں پر سائیں پھلی کے سانس کا بلبلہ
الگ ہوتا ہے.. ہم جانوں ہیں کہ پھلی کے ہر سانس کے درمیان لکھاوت ہوتا ہے اور جب
اس حساب سے پانیوں پر بلبلے ظاہر ہوتے ہیں تو ہم پہچان جاتے ہیں.. اور پھر اس مقام پر جال
ڈال دیتے ہیں...“

یہ خاموشی مقدس تھی.. اس میں بولنا گناہ تھا..

وہ چکلی بار کشی سے الگ ہو کر اسے دور سے دیکھ رہا تھا.. وہ نیلے ناپو کے ساتھ اپنا
وجود جوڑے وہ پانیوں کی عظیم و سعت میں جمran اور گشہ تھی اور اس کے باوجود اس کا مختصر

وجود ہی اس تقابل کو جنم دیتا تھا جس کی خیرات سے منظر تاحد منظر پھیلتا اور و سچ ہوتا تھا.. وہ ایک پھولی سی مجازی تھی جس کی وجہ سے صحرائی عظمت کا اندازہ ہوتا تھا..

”میرا خیال تھا کہ تم لوگ بس پانیوں میں ہاتھ ڈالتے ہو تو پھلی گرفت میں آجائی ہے..“

”بھی ہم لمبا نے یہ سوچتے ہیں کہ آپ سائیں کے لیے موڑیں اور بنگلے تیار ملتے ہیں... آپ کوئی کام کا ج نہیں کرتے اور یہ تیار ملتے ہیں... رزق ہاتھ ڈالنے سے ہاتھوں میں تو نہیں آ جاتا سائیں.. پسند بہتا ہے اور محنت ہوتی ہے تو پھلی ہاتھ میں آتی ہے... پر آج ویری ہو گئی ہے.. رات دکھن کی ہوا چلی تھی سائیں اس لیے پھلی نیچے گھرے پانی میں چلی گئی ہے... پر اپنے پونگ کے پیچے آئے گی.. ایک بھی نظر آگئی تو ہماری ہو گئی...“
وہ پھر سانس روک کر بیٹھ رہے..

سرور بہت دیر دھونی رہائے دم سادھے بیخارہا یعنی اس کی نظروں کی ہاک میں آئے سندھ کے پانیوں پر کسی پھلی کے سانس کا بلجناد اٹھا..

جعفر کو وہ دیکھ سکتا تھا کہ وہ ہو لے ہو لے کشتنی میں سے سامان لکال کر رہیت پر ذہیر کر رہا تھا.. پھر اپنے سدا کے بھوکے اور ندیدے بیچ کو اپنی چھاتیوں میں پناہ دیئے رہت پر آلتی پالتی مدارے بیٹھی تھی..

یہ تھائی اور رہیت اور پانی کی ایک ایسی کائنات تھی... ہلکتے سورج میں ڈھلنی ایک ایسی کائنات تھی جس میں صرف وہ ایک کشتنی تھی جو انہیں اس کائنات میں لے آئی تھی اور صرف وہ تھے.. سرور کے اٹھے ہوئے ہاتھوں میں منتظر تھوڑا جاں.. جعفر، پھر اور وہ.. اور اس کے رہیت پر پڑے.. اوندوں میں پڑے جو گر شوڑ..

دھوپ سے خالی ہوتے آسمان میں پرندوں کی ایک ڈار نمودار ہوئی... بہت بلندی

پر..

سرور نے پہلی بار پانی سے نظریں ہٹائیں اور اوپر نگاہ کی ”... سائیں آپ بہت دیر سے آئے ہو.. ان رتوں میں یہ ماں بجو.. نیچے نہیں اترتیں.. یہ اپنے دیوں کو لوٹ رہی ہیں.“

وہ جانے کو نہیں تھیں امرغایاں تھیں یا سرخابوں کے غول تھے آسمان پر ایک لمحہ

نمودار ہوئے اور دوسرے لمحے آسمان خالی ہو گیا۔ اپنے دیسون کو لوٹنے والے ہمیشہ شتابی میں ہوتے ہیں اُرکتے نہیں۔

ذہنیتے رہے۔

آخر کار سرور کی برداشت جواب دے گئی اور وہ انہوں کھڑا ہوا "مل گیا تو شکار.. نہیں تو بیکار... تو سائیں آج تو سب بیکار"

سندھ کے پانیوں پر اتری گھنیری گھپ رات میں..

پانیوں کی بے آواز سیاہ چادر پر ستارے اترتے تھے۔ اس پر بچھے ہوئے تھے اور یہ ستارے اس پر... جہاں تھاں وہ چادر پھلتی تھی... ناپوؤں اور جزیروں کے اندر تک جاتی تھی وہاں تک وہ اس پر جو ستارے تھے۔ اس پر دوپٹے پر ناگی مکیش کی مانند ٹھہماتے جاتے تھے... یہ ڈوبتے تھے اور اُبھرتے تھے اور ان پر سرور کی پرات کی جھنجھناتی چھنک اور مالاں جعفر کے منکے کے منہ پر بندھے ململ کے کپڑے پر جہائی گئی آئئے کی تھے پر پرانی تحاب کی تالی تیرتی جاتی تھی... اور کہیں سندھ کے پانیوں میں اترے ہوئے کسی ستارے پر اس تال کا بوجھ پڑتا تھا تو وہ پانی میں ڈوب جاتا تھا اور کہیں وہی چھنک اور تال کسی ستارے کی لوبڑھادیتی تھی..... اور جب یہ لوبڑھتی تھی اور پانی پر روشنی بکھرتی ہوئی اُس رستے ناپوؤں کی پہنچتی تھی جہاں سے یہ مدھر تال آتی تھی تو وہاں وہ کیا رکھتی تھی... اسے ناپو تو دکھائی نہیں دیتا تھا گھنیری رات میں صرف گھپ اندر ہیرے کے پیچ میں بھڑکتے الاؤ کے گرد سرور دکھائی دیتا تھا جس کا سیاہ جنک پسینے میں بھیکتا تھا اور آگ کی روشنی میں وہ پسینہ لٹکھاڑا کہیں مارتا تھا اور اُس کا ایک قطرہ... ایک بوند اس پرات کی پشت پر گرتا تھا جس پر سرور کے مرغابی کے بچوں ایسے ہاتھ اتنی تیزی سے تحاب دیتے حرکت کرتے تھے کہ وہ دو نہیں درجنوں لگتے تھے... دھیان اندرا میں متحرک پرات کو تیزی سے تحکمتے ہوئے اور اس پرات میں سے ایک دل پنیر حال ذاتی بے خود کھنک دار دھرم تاریکی میں چھکتی ہوئی بکھرتی تھی۔

مال جعفر اس کے برابر میں سرگاؤں اپنے منکے کے ٹنگ دہانے پر جھکا اس پر یوں تحاب دیتا تھا کہ ایک گھنی طبلہ نماگبری گونج دھڑکتے دل کی طرح دھک دھک کرتی اٹھتی تھی اور عرش پر دیکھیں دیتی تھی۔

پہنچی الاڑ سے ذرا بہت کر رہیت میں دھنسی بیٹھی تھی اور الاڑ کی جتنی روشن بھڑک اس تک پہنچتی تھی اس کے چہرے لمبے پر چھلیتی اس کی تاریک آنکھوں میں جا جذب ہوتی تھی اور انہیں انہیں انہیں جھرے میں غیر مرکی طور پر چھکتی دھمکتی کسی بلی کی آنکھوں ایسا کرتی تھی... وہ خود کم دکھائی دیتی تھی پر اس کی آنکھیں تاپوکی تاریکی کے اوپر معلق جلتی بھڑکتی دکھائی دیتی تھیں..

اور صاحب تھا.. جو اس منظر میں بے جواز تھا..

اس کا نکات کانہ تھا.. کسی اور سیارے سے اڑا ہوا بے جواز اپنی تھا اور اس منظر میں ایک پیوند لگتا تھا..
ستارے کی نویں سب کچھ دیکھ کر انہی قدموں پر پانیوں پر لٹکتی واپس چلی جاتی تھی..

ملحا ہال نہ بیڑی خیل ساہنہے یار و بخنا ..

ماں اور بھانجادوں اپنے چٹے سخید دانت گھور انہیں جھرے میں لٹکاتے، جزرے دہاں تک کھولے جہاں تک ان کے گلے کی گھنڈی تھر تھراتی نظر آتی تھی... منه چڑائے گا رہے تھے اور اپنے مہانے ساز... پرات اور مٹکا بجا رہے تھے... بے خود اور مست ان پر بچکے ہوئے تھے اور گارہے تھے.. ملا جا... جا... جا..... وہ حاچا کو طول دیتے چلے جاتے اور پھر یکدم سر جھکا کر اپنے ملکے اور پرات کو پینٹنے لگتے... بیدر دی سے مگر نر کے اور ہال کے اندر اندر... ہال نہ بیڑی خیل ساہنہے یار و بخنا... یار ملا جا بھی کشتی کو سندھ سائیں کے پانیوں پر رواں کرنا کہ ابھی تو یہرے یار نے بھی پار جانا ہے...

خاور ریت پر بچے اپنے سلیپنگ بیگ پر گوٹھ مارے بیٹھا نیند سے بے بس ہوتا ڈھے رہا تھا.. اسے اس چوہیانے پھیلی شب سونے نہ دیا تھا.. یہ مہانے بھی بے مہار ہوتے تھے اور اسے سونے نہ دیتے تھے.. ان کے چہرے الاڑ کے مقابل جیسے جیل سے پوچھے ہوئے ہوں یوں لٹکتے تھے.. جیسے وہ کوئی افریقیں جادوگر طبیب ہوں اور اپنے پر کھوں کی رو جوں کو بلانے کے لیے گئے چڑا چڑا کر ایک بے اختیار رو حالی کرب میں جتنا گاتے جا رہے ہوں... ان کی لے میں بھی ایک قدمیں.. جان بوجھ کی سلطنت سے پرے کا خوف تھا جو تاریکی میں ذوبے سرکنڈوں میں سے سر رہاتا آتا تھا اور پھر ان کے ہاتھوں کے راستے ان کے

خود ساختہ سازوں میں منتقل ہوتا تھا۔

گنبد نما خیر جو خاور کا مسکن تھا اس بینک سے اتنا پرے تھا کہ نظر دہاں تک جاتے جانتے تاریک ہو جاتی تھی۔

اس کے ذہن میں اس آبی سفر کا جو تجھیں تھا اس میں ایک ست روی تھی پانیوں پر
لکوڑے لستی ہوئی اور پھر تھا اور انگ تھاگ رائیں تھیں۔ مہانوں کے لشکتے ہوئے مہاندرے
اور پکھی کے چوڑے کوئے اور اس حرم کی مویقی سے دھڑکتی ہوئی رائیں نہ تھیں۔
آج شکر نہیں مان تھا اور ان کے لیے سب بیکار ہو گیا تھا۔

شاروی اتے بجان دی تاہنگ رہندی اے

شادی تے تیاری اے دل دار بجان... ملا جا... جا... جا... ہال نہ یہ زی ٹھیں جھیل...

جو خود ملاج تھے وہ بھی ملاج کی خدمت میں درخواست گزار رہے تھے کہ ابھی تو
کشتی کو نہ تھیلنا۔ سلاجے بارہ بجاناں...

تاریکی اتنے سے چیختراہوں نے سامان کشتی میں سے اہم لیا تھا۔

ہال تیرتی تھی پانیوں پر جلتے ستاروں کو بھاتی تھی۔۔۔ پھر جلاتی تھی۔

تاریکی اتری تو ان کا چوپہار دشون ہو چکا تھا اور د پکھی میں برمائی کے ذریے پر آج صبح
تک کر کر اتنی مرغی دلکی گئی میں... جو جل اختتھا یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتی تھی... لیکن ڈولکی پر
بند مٹھی پکھی کی نہ تھی مرد رکی تھی.. کھانے سے فارغ ہو کر گویا وہ صاحب کی غلامی سے آزاد
ہو گئے تھے، اس کے ساتھ کمل غفت بر تھے وہ اٹھے، سرور اور جعفر... اور ہاپو کے ایک
رستھنے لیلے پر جا بیٹھے اور تھوڑی دیر بعد احر سے گھنگروں کے چمن چمن کی آواز ایک تسلی
کے ساتھ آنے لگی تھی.. وہ دونوں بڑی خاموشی سے وہاں بیٹھے ہوئے تھے اور مرد نے د
وری کو تھام رکھا تھا اور مالاں جعفر ڈنڈے سے اس کے اندر جو بوٹی تھی اسے گھوٹا جاتا
تھا.. ڈنڈے کے اوپر گھنگروں بندھے تھے اور وہ مالاں کے تجربہ کارہاتھوں کے تھوک کے
ساتھ چمن چمن بجتے تھے..

بوٹی تیار ہونے پر وہ اپنے نیلے سے اتر کر اس کے پاس آئے "سامیں بوٹی پیو گے؟"

"نہیں.. تم ہو"

"سامیں چس آجائے گی ایک گھونٹ تو بھرو.. سنده سامیں کے بیلوں میں اگئے

والی خاص بولی ہے... اندر جاتی ہے تو ملک چاہیتی ہے۔“
”نہیں...“

اور اب بولی نے ان کے اندر ملک مچا رکھا تھا اور وہ اپنی اپنی ہال کی دھمک میں
ڈوبتے جھوٹتے اور مگن ہوتے تھے پر ایک بھی ہاتھ بے سرا نہیں پڑتا تھا۔
الاؤ کے گرد خاور اُسرد اور جھپڑا ایک چھوٹی سی روشن پر شور دیکھتی ہوئی کائنات
تھے اور ان کے چار پھیرے اگرچہ سندھ تھا اس کے جنگل بیلے اور آسمان تھا لیکن وہ سب
رات کے بلیک ہوں نے نگل لیے تھے.. لیکن جب کبھی وہ پیچھے مر کر دیکھتا تھا تو اس بلیک
ہوں میں اسے وہ آنکھیں جلتی اور جپکن دکھائی دیتی تھیں.. سندھ کے دو پہ پر جو نکیش
ٹمٹما تھی ان سے الگ ہوتی تھیں اور مگن تھیں اس یقین میں کہ ان کا جادو لوٹا بھی نہ بھی
اڑ کرے گا.. وہ آنکھیں اس کی کمر میں چھیدہ ذاتی تھیں اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہ مر کر
اوہ مر دیکھ لیتا تھا۔

سرور اور جھپڑ بے تکان تھے.. ان کے اندر ملک مچاتی بولی ان کے ہاتھوں کی
گردش اور گلے کے لوج میں ڈھلتی تھی.. یکدم ان دونوں کے ہاتھ رک گئے.. جہاں تھے وہیں
سماکت ہو گئے اور جزیرے کھلے کے کھلے رہ گئے اور آواز کا بہاؤ ختم ہیا۔ گھپ اندر یہری خاموشی
اڑی جس میں الاؤ میں جلتی نہیں کی انگارہ نوٹ پھوٹ اور سندھ کے پانیوں کی دھیں
سر مر اہٹ کے سوابک گونہ تھا۔

کنارے کے پانیوں پر موٹی موٹی آنکھیں رکھے کوئی مینڈاک زور زور سے زرانے
لگا۔

سرور نے اپنی پر ات ریت پر اوہندھی کی اور کھڑا ہو گیا.. اپنے پورے بٹے کے
ساتھ سننے لگا اور پھر سندھ کے نکیش ناٹکے دوپنے کی جانب اشارہ کر کے کہنے لگا ”اوہ تو نہیں
آیا کھڑا ہے سائیں..“

”کون؟“ وہ پر ات اور نکھنے کی ہال کے یکجنت نوٹے اور خاموشی کے گرنے سے
ابھی مغافلہ نہ کر پایا تھا۔

”نہیں سائیں“

اس نے اپنے آپ کو دھنستی ریت میں سے بمشکل الگ کیا اور انھی کھڑا ہوا.. اور

اسے بہت وقت ہوئی گھنٹوں پر بہت زور پڑا۔ وہ اٹھا تو ان سالمخوردہ گھنٹوں پر ہاتھ رکھ کر سیدھا ہوا۔ ڈاکٹر طاہر درست ہی کہتا تھا۔ تمہیں اپنے بدنبالی زوال سے سمجھو دے کر لینا چاہئے۔ یو ہیو ٹولیو دادا!

”کون؟“ اس نے پھر پوچھا۔

”آپ کا باور پھی سائیں.. وہ آیا کھڑا ہے۔“

”کہاں آیا کھڑا ہے..“ اس نے جھلا کر کہا اکہ اس کے سامنے دور دور تک سندھ سا گر کی چادر پر بلٹے بیکھتے بے انت و بیئے تھے...
”وہاں...“

وہ رونوں ہاتھ ہاتے ہوئے۔ مکراتے کنارے کی طرف بڑھنے لگے اور وہ بھی ان کے پیچے ہو لیا۔

کنار پانی کی سطح سے خاصا بلند تھا۔ اور پھر بھرا تھا۔ اس لیے وہ ذرا دا حڑک گئے۔
وہ رونوں سامنے دیکھنے لگے اور وہ کچھ بھی دیکھتا نہ تھا اس لیے بے بھی سامنے لگا۔ خاموشی میں کنارے کی ریت کا کوئی حصہ نہیں جاتا اور اس سکوت میں جس میں دھیمی روایں سرسر ابھت تھیں اور ایک مینڈک نراثا تھا دھرام کی سی ایک آواز آتی۔

وہاں جدھر وہ اشارے کرتے تھے۔ وہاں پانیوں میں سوائے نیم تاریک غمہماہت کے اور بے انت ہادری کی کے اور دیکھنا تھا پر وہ دا حڑک بیکھتے تھے اور اشارے کرتے تھے۔
ایک طویل مدت کے بعد ریتلے اور اوپنے کنارے کے میں نیچے گمراہی میں،
پانیوں کی سیاہ چادر میں سے ایک آسیب نمائش نمودار ہوئی۔ ہوئے ہوئے باہر آئی اور پھر نیچے سے ایک انسانی آواز آئی ”ہوئے سرور...“

”اوھر اور اپر آئے کھڑے ہیں سائیں..“ سرور نے نہایت پر اشتیاق لجھے میں ہادری کے اندر جھاگلتے ہوئے آواز دی۔

”ہوئے فیم..“ جعفر بھی آگے ہو گیا۔

وہ آسیب پانیوں میں سے نکلا۔ اور دیکھا اور پھر بھر بھرے کنارے پر چڑھتا چلا۔ مگریں بھرتا اور ان تک آپنچلا۔
اس کے سر پر گلھڑی تھی جسے اس نے ایک ہاتھ سے تھام رکھا تھا۔ وہ الف نگا تھا